منتخب آپ بیتیوں میں تاریخ، سماج اور ثقافت کی عکاسی

Combination of History, Society and culture in Selected Autobiographies

اسرار احمد کولاچی

پی ایچ ڈی (اردو) سکالر بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

ڈاکٹر ارشد محمود آصف

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

Abstract

This article contains many angles of the human related things, which have been discussed in the autobiographies since beginning. It is fact that every literal as well as commonsense person wants to know about history of the area or the world and try to trace out which depends upon the facts and figures. But history has always shown the only the side of the kings or the dominants' but not present the whole truth about the society. On the other hand autobiographies show the picture of whole the phenomenon and original aspects of the prevailing norms of civilization.

To present the truth, authenticity and importance of the autobiographies in the literature as well as to elaborate such kind of accuracy in biographies, this research article has been written for this purpose.

انسانی زندگی اور اس سے متصل اشیاء کا دائرہ تین زمانوں پر محیط ہوتا ہے۔ اسی انداز کی گردش دوراں آج سے نہیں ہے بلکہ ابتدائے دنیا سے ہی اسی طرح ہی وجود پذیر ہوتی ہے، اور رہتی دنیا تک یونہی رواں دواں رہنے کی امید ہے۔ وہ ادوار یا زمانے کون سے ہیں جن پر پوری انسانی زندگی / تاریخ کا انحصار پایا جاتا ہے۔ ابد الآباد سے انسان فطرتاً اپنے سے پہلے ہونے والے واقعات اور مشاہدے سے حاصل ہونے والی معلومات کی بنا پر اپنے لیئے زندگی گذارنے کے راستے متعین کرتا ہے۔ عموماً آثار، یادداشتیں، سینہ بہ سینہ وراثت سے موصول شدہ معلومات سے ہی سیکھتا اور پیش بندی کرتا دکھائی دیتا ہے۔

ماہرین سماجیات اور سائنسدانوں کے محتاط اندازوں کی رُو سے مطالعہ کیا جائے تو معلوم کیا جا سکتا ہے کہ زندگی / دنیا کی عمر ہزارہا اور کروڑہا برس بنتی ہے۔ ابتدائی انسان اکیلا یا تنہا زندگی بسر کر رہا تھا، اس ارتقائی مرحلہ میں خود تنہا پسندی کو چنا گیا یا لاشعوری طور پر عمل میں آئی۔ ارتقائی سفر طے کرتے کرتے بہ وجوہ انسان نے سماجی و معاشرتی نظام زندگی کو اپنایا۔ ان عوامل کے باوجود فرد لاشعوری طور پر دور گم گشتہ کو بھولا نہیں، کسی نہ کسی طور اس کو اپنے دل و دماغ یا کسی بھی طرح دانستہ یا نادانستہ محفوظ کرتا آیا ہے۔ گو کہ ایسے ٹھوس شواہد کی عدم دستیابی کے باوجود، کہنے میں کوئی حرج حائل نہیں ہوتا کہ طویل ترین عرصے تک علمی یا قلمی / تحریری مواد میسر نہیں تھا۔ تاہم اس کے برعکس ترقی یافتہ نہ سہی لیکن ایک سادہ نظام لاشعوری طور پر انسان کے اندر موجزن زندہ و جاوید تھا۔ مثلاً: خاکے کھینچنا، اشکال کندہ کرنا، مورتیاں بنانا، الٹے سیدھے نشانات لگانا، سینہ بہ سینہ ساعتوں تک رسیدہ داستانیں یا حکایات کو ازبر کرنا اور اپنی اگلی نسل تک پہنچانا لازم و ملزوم تھا۔

گذرے وقتوں کے حالات و واقعات کو مستقبل میں آنیوالی قوموں یا لوگوں تک ان مقاصد تک رسائی دینے کے لیے خالقِ کون و مکاں نے ایک ارتقائی سلسلہ شروع کیا ہوا تھا یعنی صحائف اور کتب آسمانی۔ ان کو بھی لوگوں کو صراطِ مستقیم پر لانے اور ان کو گذرے وقتوں سے آگاہی دینے کا ذریعہ بنایا، ان صحائف و کتب میں پرانے زمانوں کو مختلف قصوں میں بیان کیا گیا وجہ وہی رہی کہ فرد اور سماج ماضی سے درس تحصیل کر کے اپنی دنیا اور عاقبت کو سنوارنے میں ہمہ تن مصروف عمل رہے اور زندگی و دنیا کا پہیہ رواں دواں رہے۔

دنیا کی تاریخ سے اکثر اوقات یہی معلومات میسر آتی ہیں کہ ماضی کے حالات و واقعات سے واقف ہونے کا ذریعہ سینہ بہ سینہ کہانی یا داستان گوئی رہا۔ انہی حاصلات کی بناء پر ہی اکابرین وقت نے اپنے لیے راستے متعین کیئے۔ گردش ایام کی جانچ پرکھ کی ضرورت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے شاعر مشرق علامہ اقبال کہنے پر مجبور ہوئے:

ہاں دکھا دے اے تصور پھر وہ صبح شام تو
دوڑ پیچھے کی طرف اے گردش ایام تو

وقت کی بے لگام تیز رفتاری سے ردوبدل ہوتا گیا،لوگوں نے ماضی میں جھانکنے کے لیے نت نئے طور طریقے اختیار کر لیئے مثلاً :کتابت شروع ہونے سے کتابیں تحریر ہونا شروع ہوئیں، قصے، کہانیاں، داستانیں اور تاریخ کو انواع و اقسام میں صفحہ ء قرطاس پر لانا شروع ہوا۔ معاشرتی نظام نے مزید ترقی کی منزلیں عبور کیں تو ہر چیز کو نفسیاتی طور پر دیکھا جانے لگا یہاں تک کہ تاریخ کا مضمون بھی اس نوع کی چھلنی سے نکالا جانے لگا، کیوں کہ تاریخ کا قابلِ اعتبار ہونا بھی اشد ضروری تھا۔ گو کہ اس عمل میں دشوار گذار مراحل طے کرنا تھے مگر حقائق سب سے زیادہ مقدم تھے۔ انہی وجوہات کی بناء پر سب تکالیف کو عزم صمیم سے جھیلنا تھا۔ مشکلات اور صعوبتوں کے بعد ہی حقائق کو پایا جاسکتا ہے، اس ذیل میں احمد ندیم قاسمی الفاظ کی صف آرائی اس انداز میں ہے:

یوں تو حائل میرے رستے میں سمندر کتنے
چند یادوں کے سفینے ہیں سلامت اب تک

تاریخ کو دوسرے الفاظ میں یہ کہنا بے جانہ ہو گا کہ ماضی یا تاریخ کو محفوظ کرنے کے لیئے فرداً فرداً بھی کوششیں ہونے لگیں۔ ویسے تو کسی شاعر نے یہ تک کہ دیا کہ "یاد ماضی عذاب ہے یارب چھین لے مجھ سے حافظہ میرا!" اس کے باوجود بھی گردشِ دوراں کی کروٹوں کی طویل جدوجہد کے بعد ایک دور ایسا آیا کہ چند گنے چنے لوگوں نے اپنی یادداشتیں محفوظ کرنے لگے، بلاشبہ ان کو مستند تاریخ کا درجہ تو نہیں دیا جاسکتا لیکن، کسی حد تک ان میں بھی تاریخ کے بارے میں خالص اشارے مل سکتے ہیں۔ اس نوع کی یاد داشتوں کو آپ بیتی، خود نوشت یا سوانحی ادب کا نام دیا گیا۔ اس طرح ماضی کے جھروکوں کی مختلف زاویوں سے کئی ایک کھڑکیاں کھلتی چلی گئیں اور ماضی اور تاریخ کی جھلکیوں کے انبار لگ گئے۔

آپ بیتی، سوانح عمری اور خود نوشت روز نامچہ، کی اہمیت اس وقت معلوم ہوتی ہے جب ان تینوں اصناف کو اردو زبان میں سوانحی ادب کے نام سے نمایاں کیا گیا۔ انگریزی ادب میں تو اچھا خاصا عرصہ پہلے اس نوع کا ادب اپنی جگہ بنا چکا تھا۔ سوانحی ادب صرف اپنی ذات یا ایک شخصیت تک محدود ہونے کے باوجود اس دور کی نہ صرف تاریخی بلکہ سیاسی، سماجی، معاشرتی، نفسیاتی اور ثقافتی حقائق سے پردہ کشائی بھی کرتا ہے، یہی وجہ ہے کہ اس ادب سے تاریخی نوعیت کا کام بھی لیا جاتا ہے، اوائلی دور کی تاریخ بادشاہوں اور امراء تک ہی محدود رہتی تھی، اگر حقیقت کی عینک لگا کر مشاہدہ کیا جائے تو احساس ہوتا ہے کہ سچی، کھری، بنیادی تاریخ اور معاشرت کا منبع عوام سے ہی ملتا ہے اور وہ تاریخی آثار سوانحی ادب کے مرہون منت ہوتے ہیں۔ تاریخ اور سوانحی ادب کے متعلق ڈاکٹر محمد عمر رضا اپنی تحریر بعنوان "اردو میں سوانحی ادب، فن اور روایت" میں اس طرح روشنی ڈالتے ہیں:

> "تاریخ میں عام طور پر کسی خاص عہد کے بادشاہوں اور حکمرانوں کی فتح و شکست کی داستان بیان کی جاتی ہے جسے مؤرخ اپنے نقطۂ نظر اور مخصوص انداز بیان میں پیش کرتا چلا جاتا ہے۔ اس طرح واقعات کی ایک خشک کھتونی قارئین کے سامنے آجاتی ہے۔ لیکن اس کے برعکس سوانحی ادب کے تحت وہ تحریریں آتی ہیں جن میں کسی فرد واحد کی زندگی اور اس کے عہد سے وابستہ دیگر ظاہری و باطنی حالات کا بڑی باریک بینی سے تجزیہ پیش کیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سوانحی ادب اور تاریخ میں امتیاز کے باوجود اس کی تاریخی اہمیت مسلم ہے۔ دونوں کا تعلق ماضی سے ہے اور دونوں میں تحقیق، چھان بین، ماخذوں کا انتخاب اور دیگر ضروری باتوں کا خاص خیال رکھا جاتا ہے جس سے کسی بھی شخص یا عہد کے متعلق بنیادی حقائق منظر عام پر آجاتے ہیں۔"(۱)

بنظر غائر جائزہ لیا جائے تو اندازہ کرنا مشکل نہیں ہے کہ جب ایک انسان اپنی زندگی کے بارے میں تحریر کرنے کی جسارت کرتا ہے، تو وہ اپنے آپ کو کسی بھی طور پر ماحول اور معاشرے سے الگ تھلگ رکھ کر تحریر سامنے لانے سے قاصر ہوتا ہے۔ ارسطو کی کہاوت زبان زدِ عام ہے کہ "انسان سماجی جانور ہے" یعنی اکیلا رہنے کے لیے نہیں بنا بلکہ اس کی زندگی کا انحصار معاشرے پر مرکوز ہے۔ یقیناً کوئی بھی شخص معاشرے کے کسی بھی عمل سے علیحدہ نہیں ہوتا، شعوری یا غیر شعوری طور پر ان اقدار و اعمال سے منسلک رہتا ہے۔ یونہی سوانحی ادب کے تخلیقی کام کے ساتھ ساتھ بغیر تاریخ کا نام لیے تاریخ تحریر کی جارہی ہوتی ہے جس میں دراصل عوامی، سماجی، ثقافتی، سیاسی، معاشی اور حقائق پر مبنی تاریخ کے تانے بانے بنے جارہے ہوتے ہیں۔

عربوں میں ایک رسم تھی جو مدتوں سے چلی آرہی تھی کہ جب بھی کسی کے ہاں اگر بیٹے کی پیدائش ہوتی تو ابتدائی چند ماہ کے دوران اس بچے کو دیہات میں پرورش کے لیئے کسی دایا کی سپردگی میں بھیج دیا جاتا، اس رسم کی بنیادی وجہ یہی ہوتی کہ دیہات کی غیر آلودہ فضا اور خالص غذاؤں کے استعمال کے باعث وہ بچہ

صحتمند اور توانا ہو جاتا، دوسری وجہ جو بیان کی جاتی ہے وہ اس طرح ہے کہ خالص خوراک کے ساتھ ساتھ دیہاتوں کی زبان بھی بلکل خالص ہوتی ہے، لہٰذا اس بچے کی گفتگو اور زبان بھی شستہ اور خالص ہو جائے گی، اسی امر کو مدِ نظر رکھتے ہوئے نبیء آخر الزمان حضرت محمد مصطفیٰ احمد مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بھی پرورش کے لیے دائی حلیمہ سعدیہ چُنا گیا اور ان کے حوالے کیا گیا تھا۔ تاریخ کے ذیل میں بھی غور سے نظر دوڑائی جائے تو کم و بیش ایسے ہی نتائج بر آمد ہونگے، ایک تاریخ وہ ہوتی ہے جو امرا ٔ و سلاطین کی جانب سے تحریر کردہ ہے جس میں عوامی رنگ کی آمیزش نہ ہونے کے برابر ہو گی جب کہ اس برعکس جو عوام میں اندر رہتے ہوئے اپنے حالات بغیر کسی غرض و غایت کے تحریر کرتا ہے تو وہ بے لوث ہو کر انہیں ضبط تحریر میں لاتا ہے۔ تاریخ کے نقطۂ نگاہ سے ڈاکٹر صبیحہ انور، "اردو میں خود نوشت سوانح حیات" میں "یادِ ایام" مصنفہ نواب چھتاری کے پیش لفظ میں سر تیج بہادر سپرو کے تحریر کردہ خیالات سے خود نوشت سوانح حیات میں کے تاریخی پہلو پر بہت زور دیا ہے:

> "انگلستان اور یورپ کے دیگر ممالک میں اس قسم کی کتابیں لکھنے کا بہت شوق ہے۔ علاوہ اس کے کہ بڑے تجربے کار آدمی کی زندگی کا حال معلوم ہوتا ہے ایسی کتابوں سے خاص فائدہ یہ ہو کہ اس سے ملک کی ترقی و تنزلی کے اسباب معلوم ہوتے ہیں اور ایسی کتاب سے تاریخ کا مواد تیار ہوتا ہے۔"(۲)

خود نوشت یا سوانح عمریوں کی اہمیت کے موضوعات پر ایک نظر ڈالی جائے کہ مذکورہ ادب میں مصنف کون سے عنوانات کو اپنی تحریروں کی زینت بنانے کی دانستہ یا نا دانستہ کوشش کرتا ہے یا کس نوعیت کی تحریروں سے اپنی تصنیف کو پر کشش یا دلچسپ بنانے کی جستجو میں محو رہتا ہے۔ ہر انسان یا خواندہ شخص کی اولین ترجیح ہوتی ہے کہ اس وقت کا یا اس علاقے کا ماحول کیسا ہے، وہاں کے مکینوں کی سماجی زندگی کے صبح و شام کس نوع کے ہیں، مشاغل کیا ہیں، رہن سہن کے لیئے مکانات کی اٹھان، دعوتیں، رسم و رواج، سوچ کے زاویے، حسن و جمالیات کے پیمانے کس انداز کے رواج پذیر ہیں۔ ایک سوانح نگار یا خود نوشت نگار اپنے اوپر اور گرد و نواح میں وقوع پذیر ہونے والے واقعات اور حالات کو کم و بیش حقیقت نگاری کرتے ہوئے صفحۂ قرطاس پر روشنائی کی مدد سے رقم کرتا جاتا ہے، اپنی تجربات کی روشنی میں ان پر رائے زنی کی بھی سعی کرتا رہتا ہے، اس لحاظ سے وہ حالات زندگی، وہ سماجی اقدار، جمالیاتی اوزان، علمی و عملی رودادیں، عوام کا چلن، ان کی عمومی سوچ اشارے بھی بہ احسن انجام دینے کی بھرپور کوشش میں مگن و مصروف پایا جاتا ہے۔ سماجی و ثقافتی اہمیت و افادیت کے عنوان کی رو سے ڈاکٹر محمد عمر رضا اپنی تحریر کے اس پیرائے میں واضح کرتے ہیں:

> "سوانحی ادب میں محض سیاسی تاریخ ہی بیان نہیں کی جاتی بلکہ اس میں فرد واحد کے دور کی سماجی، معاشی اور ثقافتی کشمکش کا بھی اظہار کیا جاتا ہے۔ سوانحی تحریروں میں کسی نہ کسی زوایے سے فرد واحد کی پوری یا ایک خاص عہد کی زندگی میں جس نوع کی بود و باش، لوگوں کے عادات و اطوار، لباس، طعام، تعمیرات، موسیقی، ادب اور دیگر سماجی، معاشی اور ثقافتی حالات ہوتے ہیں، ان کا ذکر کیا جاتا ہے۔"(3)

اس انداز تحریر کا جو کہ سوانحی ادب کا خاصہ ہے کے اثبات پر ڈاکٹر صبیحہ انور کا نقطۂ نظر بھی دیکھتے ہیں، ڈاکٹر صاحبہ تحریر میں اپنا موقف اس طرح پیش کرتی ہیں:

> "خود نوشت سوانح حیات کا یہ وصف اس منصفانہ خوبی کا غماز ہو بلکہ تاریخ کے طالب علم کے لیے ضروری بھی ہو۔ قدیم ادب میں تقریباً ہر تاریخ اور تذکرے میں مصنف کے حالات زندگی خود نوشت سوانح حیات کی شکل میں ضرور ملتے ہیں اور اگر ان کو یکجا کر لیا جائے تو بہترین نتائج اخذ کیے جاسکتے ہیں کیونکہ مصنف کی نظر زندگی کے ان تاریک اور باریک گوشوں پر بھی پڑتی ہو جن پر مورخ کی نظر نہیں پڑتی۔"(4)

سوانحی ادب کے دیگر کئی ان گنت پہلوؤں پر روشنی ڈالی جاسکتی ہے، یہاں پر ایک اور نقطے پر بھی ذرا غور کرنے کی اشد ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ آپ بیتی یا سوانح نگاری میں نہ صرف حالات و واقعات کی بھرمار ہوتی ہے بلکہ اس میں کئی ایسے نقاط بھی بلا تردد شامل ہو جاتے ہیں جنہیں باریک بینی سے دیکھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ لفظ سماج ایک جامع مفہوم اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ اس میں زندگی کی تمام جہتیں شامل ہوتی ہیں، مثلاً ۔ لوگوں کی عادات و اطوار، رسوم و رواج، عوامی سوچ کی صلاحیت، علمی و ادبی مشاغل میں سماجی باشندوں کی شرکت، پہننے اوڑھنے کے آداب، کھانے پینے کے شواق، ۔ زندگی سے پیوستہ ہر ایک کام میں کوئی باطنی حکمت لازماً موجود ہوتی ہے گو کہ عوام ان سے ناواقف ہوتے ہوئے بھی لامحالہ استعمال میں لاتی ہے۔ انہی پوشیدہ خصوصیات یا لوازمات کو نفسیات کے زمرے میں شامل کیا جاتا ہے۔ سوانحی ادب کے نفسیاتی پہلو پر ڈاکٹر عمر رضا اپنی تصنیف میں ڈاکٹر تنویر احمد علوی کے حوالے سے لکھتے ہیں:

"سوانح عمریوں کا مطالعہ ہمیں مختلف ادوار کی نفسیات کو سمجھنے میں بھی مدد دیتا ہے اور مختلف افراد کے حالات زندگی اور افتاد مزاج کو بھی۔ اگر بہ نگاہ غور دیکھا جائے تو سوانحی ادب کے مطالعے کے بغیر ہم ایک زمانہ کی تاریخ، اس کی فنی روایت، تہذیبی شعور اور تاریخی ارتقاء کا مطالعہ بھی نہیں کر سکتے۔"(۵)

مندرجہ بالا بحث کے بعد اندازہ کرنا مشکل نہیں رہتا کہ خود نوشت تصانیف ہوں یا سوانح عمری کی صورت میں تحریریں ہوں ان سب میں اس حقیقت پر اکتفا پایا جاتا ہے کہ اس نوعیت کے ادب میں بہت ساری خصوصیات پائی جاتی ہیں، ان میں تاریخ، سماجی آداب واطوار، ثقافتی جولانیاں، ادبی سرگرمیاں، سیاسی منظر نامے، مذہبی اقدار اور شخصی خاکے وغیرہ۔ اسی لحاظ سے اب چند آپ بیتیوں سے اس نوع کی کچھ تحریریں سامنے لانے کی کوشش کرتے ہیں۔

سب سے پہلے سندھ دھرتی سے جڑے ہوئے ایک ایسے نابغہ ءروزگار شخصیت کی تحریر کردہ آپ بیتی سے کچھ اقتباسات پیش کرتے ہیں۔ جسٹس (ریٹائرڈ) حاذق الخیری نے اپنی یاد داشتوں کو "جاگتے لمحے" کے نام سے قلمبند کیا ہے، ان کی مذکورہ تصنیف سے تاریخ کے حوالے سے اور سماجی صورتحال کے عنوان سے چند اقتباسات پیش کیے جاسکتے ہیں۔

جسٹس حاذق الخیری نے اپنے کراچی میں آنے کے بعد جو تصویر کشی کی ہے، اس سے اُن دنوں کے کراچی کا عکس، کراچی کی تاریخ، وہاں کے موسمی حالات، مواصلات کی صورتحال کو اپنے لفظوں میں یوں بیان کیا ہے:

"کراچی وہ نہیں تھا جو اب ہے، نہ نئی دلی جیسی عمارتیں تھیں، نہ وہ سڑکیں اور ہریالی، تیز ہوا کے ساتھ ریت کا ریلا آتا تھا اور ہاتھ پاؤں چہرے اور کپڑوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا تھا، سائیکل چلانا مشکل ہوتا تھا، اور پتنگ اڑانا ناممکن، آنے جانے کے لیے وکٹوریہ یا محمد علی کمپنی کی ٹرام چلتی تھی، ٹرام میں بیٹھنے میں بڑا مزا تھا۔"(۶)

چند سطروں میں اُس دور کے کراچی کی واضح تصویر کشی ہے، دلی کی عمارات کی خوبصورتی اور دلکشی کی مشابہت کراچی کی عمارات سے کس سادہ اور پُر وقار انداز میں کی ہے، آج کراچی کو روشنیوں کے شہر کا درجہ دیا جاتا ہے اور اُن دنوں کے ریتلے پن کو کس نزاکت سے پیش کیا گیا ہے۔ گویا کہ آپ بیتی نہ ہوئی تاریخ کا ایک ورق ہوئی۔ ثقافت کی جھلک بھی ایسی سادگی سے دکھائی دیتی ہے کہ بغیر زور دینے کے باوجود سامنے آتی ہے، جیسا کہ پتنگ بازی کرنے میں حائل دشواریوں کا ذکر کیے دیتے ہیں۔ جسٹس حاذ قالخیری اپنی خود نوشت میں ایک مقام پر اپنے ہم پیشہ دوستوں یعنی وکلاء کے بارے میں لب کشائی کرتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ تاریخ کی کتنی گرہیں ایک پیرائے میں بیان کر گئے ہیں، اس سے بہتر تاریخ نویسی کا اہتمام ممکن نہیں، آپ لکھتے ہیں:

"جب اے کے بروہی صاحب ایڈووکیٹ جنرل سندھ بنے تو انہوں نے 'باوا اینڈ عارفین' نامی ایک وکیلوں کی فرم بنائی، جو بروہی صاحب کے دفتر کورٹ چیمبر میں واقع تھی، باوا بیرسٹر تھے، ان کا تعلق جنوبی افریقہ سے تھا، سنا ہے کہ بڑے اچھے قانون داں تھے، کیس کی بڑی تیاری کر کے عدالت جاتے تھے لیکن جج کے سامنے پیش ہوتے ہی ان کے جسم پر کپکپی طاری ہو جاتی تھی، اس موقع پر عارفین صاحب مقدمہ سنبھال لیتے تھے۔ کچھ اسی قسم کا واقعہ گاندھی جی نے اپنی خود نوشت میں رقم کیا ہے کہ جب انہیں اپنا پہلا کیس ملا تو وہ اسمال کوزز کورٹ کا تھا، مقدمہ دیوانی کا تھا اور جج انگریز تھا، جب گاندھی جی کی باری آئی تو جج نے کہا، یس مسٹر گاندھی، گاندھی جی چپ چاپ کھڑے رہے کچھ نہیں بولے، جج نے کئی دفعہ پوچھا لیکن گاندھی جی اسی طرح کھڑے رہے، آخر کار ڈھیر ہو کر کرسی پر گر گئے، پیچھے سے موکل نے کہا، بابا ہمارا تیس روپیہ واپس کرو۔"(۷)

انسانی فطرت اس امر کی متقاضی ہے کہ بچپن کو اور بچپن کے دوست احباب کو بھلائے نہیں بھلا سکتی کیونکہ اس سن کی بہت سی پیاری یادیں بار بار دہراتے ہوئے بھلی لگتی ہیں۔ بے فکری، لاابالی پن، شرارتیں، کھیل کود، کسی قسم کی الجھن، نہ کسی کو دینے کی فکر اور نہ ہی کسی قسم کی پریشانی۔ لہٰذا نوعمری میں ذہنی کیفیت بھی تروتازہ ہونے کے باعث بچپن کی کم وبیش تمامیادیں ازبر رہتی ہیں۔ عین اسی طرح جوانی کے ایام زندگی بھی کسی بیش بہا یا انمول رتن سے کم نہیں ہوتے، زندگی کی ایک نئی طرز شروع ہونے کو ہوتی ہے، جوش وولولہ انتہاؤں کو چھونے لگتا ہے، نئے روحانی وجسمانی رشتے استوار ہوتے ہیں، بود وباش کے لیے نت نئے کاموں کی تلاش ان میں مشکلات اور دلچسپیاں زندگی کی گردش دوراں کو چار چاند بھی لگا دیتی ہیں اور زندگی کے نئے اسباق بھی ذہن نشین کراتی چلی جاتی ہیں۔ آپ بیتی نگار بھی یقیناً اپنی زندگی کے ایسے روز وشب اسی تگ ودو میں بِتا چُکا ہوتا ہے لہٰذا اپنی کہانی جب بھی بیان کرنے بیٹھتا ہے تو ایام طفلی اور ایام شباب کو زیر بحث لائے بغیر رہ نہیں پاتا اور دراصل قاری کے لیے ایسے احوال درس وتدریس کا درجہ رکھتے ہیں اور دلچسپی کا نمونہ ہوتے ہیں، ایسا ہی احوال حاذق الخیری اپنی داستان بیان کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں:

''جب میں نے پریکٹس شروع کی تو لگا گویا بحر بیکراں ہے، جس میں غوطے لگا رہا ہوں، ہجرت سے پہلے کی خوشحالی ختم ہو چکی تھی، ہاں یہ ضرور تھا کہ گھر میں کھانے پینے کو تھا۔ کئی ملازم تھے لیکن میرا باپ دونوں ہاتھ اوپر کئے آسمان کو سنبھالے ہوئے تھا، ہم آٹھ بہن بھائی تھے، بھائی جانکے علاوہ کوئی بھی تعلیم سے فارغ نہیں تھا، بھائی جان ملازم پیشہ آدمی تھے۔ میرا عزیز دوست بدر الزمان جو میرے ساتھ ڈبکیاں لگا رہا تھا، میڈیکل کالج سے بھاگا تھا کہ مُردوں کو کاٹنا پڑتا ہے، ایک سال گوشت کو ہاتھ نہیں لگایا، میڈیکل چھوڑ کر یونیورسٹی اور لاء کالج جوائن کیا، ہم دونوں بغیر سہارے اور سرپرستی کے وکالت کے پیشے میں دندناتے ہوئے کود پڑے اور الا کو ہاؤس میں کمپاؤنڈ میں اللہ کا نام لے کر ''خیری اینڈ کمپنی'' وکیلوں کی فرم بنائی، لیکن موکل ندارد، ہوتا بھی کیسے، نہ ہمارا تعلق میمن، خوجہ یا بوہری برادری سے تھا، نہ ہی دلی کی پنجابی یا جوتے والوں کی برادری سے، باپ، بھائی۔ جج یا وکیل نہیں تھے۔(۸)

فطری تقاضا ہے، انسان بیٹے دنوں کو کسی نہ کسی صورت لازماً یاد کرتا ہے گو وہ یادداشتیں بہت دلچسپ ہوں، بہت اچھی ہوں یا تلخ و تشنع ہوں۔ اردو ادب ہو یا کسی بھی زبان میں آپ بیتی اور سوانح عمری میں تصنیف کنندہ اپنے دور کی تمام حرکات و سکنات کی منظر نگاری کر کے اپنی ذہنی اور روحانی تسکین کے ساتھ ساتھ گذشتہ دور کا عکاس بن کر سامنے آتا ہے، دانستہ یا نادانستہ اچھائیوں اور خرابیوں کی نشاندہی کرتا ہوا قلم کی روشنائی سے رقم کر کے آنے والی نسلوں کو اپنے اقدار اور ورثے کو منتقل کرنے کی مقدور بھر کوشش میں ہمہ تن مصروف عمل رہتا ہے۔ ڈاکٹر رضوان اللہ خان کی خود نوشت سے چند اقتباس قارئین کی نظر۔ آپ اپنے مسکن کی منظر نگاری کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''ساٹھ کی دہائی میں ٹاؤن پلاننگ اور صفائی ستھرائی کے بہترین نظام کی وجہ سے اسے (ٹنڈو آدم) سندھ کا پیرس کہا جاتا تھا ۔زراعت، صنعت و حرفت، تجارت، تعلیم، صحت، کھیلوں اور ہم نصابی سرگرمیوں کی وجہ سے یہ چھوٹا سا شہر نہ صرف اپنے باسیوں کو بلکہ اردگرد کے کئی کلومیٹر رقبے میں آباد گوٹھوں کے رہائشیوں کو بہترین سہولیات مہیا کر رہا تھا۔''(۹)

سماج کی بنیاد عموماً پانی کی موجودگی پر ہوتی ہے، انسانی زندگی بلکہ زندگی بغیر پانی کے ناممکن ہے۔ دنیا کی جتنی بھی قدیم ترین تہذیبیں ہوں یا جدید ترین شہر ہوں پانی کی عدم دستیابی کی وجہ ویران یا آباد ہوئے ہیں۔ زرخیز و آباد کھیت کھلیان ہی زندگی کی نوید ہوتے ہیں۔ اناج، درخت، گھاس، پھل وغیرہ سماجی زندگی کا سرمایہ ہیں ان کے سوا زندگی ناپید ہے۔ ڈاکٹر رضوان اپنے علاقے کی ہریالی اور بہترین معاشرتی و معاشی خوشحالی کا تذکرہ ان الفاظ میں رقم کرتے ہیں:

''گندم، کپاس اور گنے کی فصلیں، آم، کیلے، شہتوت اور فالسے کے باغات، سبزی منڈی، فروٹ مارکیٹ، ٹیکسٹائل ملیں،، کپاس صاف کرنے کے کارخانے، ہاتھ سے کپڑا بنانے والی کھڈیاں جو بعد میں پاور لومز بن گئیں، برف کے کارخانے، برف کی قلفی بنانے والی فیکٹریاں، دواساز کمپنی، گندم اور کپاس کی خرید و فروخت کے مراکز، مال گاڑیوں سے آنے والے سامان کے گودام، ٹرکوں سے آنے والے سامان کے لیے گڈز اسٹیشن، شہر کی تجارتی سرگرمیوں کے عکاس تھے۔''(۱۰)

سماجی و معاشرتی تقاضا ہے کہ تلخیوں اور مشاکل اور بار بار انہی کارہائے کو کرنے یا دہرانے سے مزاج میں تھکن کو دور کرنے کے لیے تبدیلی از حد ضروری ہوتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ضرورت ایجاد کی ماں ہے، اس کے مصداق ہر معاشرے یا سماج میں تفریح طبع کے لیے ثقافتی سرگرمیوں کو بروئے کار لایا جاتا ہے۔ ثقافتی اشغال میں بہت سارے اعمال شامل ہیں، جن میں کھیل، لوک شاعری، مقامی کھیل جن میں رسہ کشی، کنچے، ملاکھڑا (سندھ کی روایتی کُشتی)، لوک موسیقی، لوک رقص، پہیلیاں وغیرہ کے چرچے ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر رضوان اپنے علاقے کے حوالے سے اپنی خود نوشت میں مزے لے لے کر وہ حقائق بیان کرتے نہیں تھکتے، آیئے ایک جھلک ان کی لفظی تصویر کشی کی دیکھتے ہیں:

''اس شہر کو کھیل دوست شہر کہا جائے تو بے جا نہ ہو گا۔ کرکٹ، ہاکی، فٹ بال، والی بال کی کئی کئی ٹیمیں موجود تھیں۔ کھیل کے میدان ہمیشہ آباد نظر آتے۔ اس کے علاوہ باکسنگ، کشتی، ملاکھڑا، پتنگ بازی، لٹو بازی، مرغوں کی لڑائی، کتے اور ریچھ کی لڑائیاں، سرکس، موت کا کنواں، فٹ پاتھ پر کرتب دکھانے والے۔۔۔ اس شہر کی رنگینیوں میں اضافہ کرتے رہتے۔''(۱۱)

تاریخ، ثقافت، سماجی آداب و اطوار کو پرکشش انداز میں سوانحی ادب پیش کر کے بام عروج اور دوام بخشتا ہے شاید وہ روکھی پھیکی تاریخی کتابیں اس قدر اثر انگیز اور دلچسپ اور حقائق پر مبنی نہ ہوں۔ تاریخ کی بھاری بھر کم کتابیں شاید چند سماجی پہلوؤں کا احاطہ نہ کریں جتنا خود نوشت اور سوانح عمریاں واضح اور دلچسپ پیرائے میں محفوظ اور منتقل کر سکیں۔ ہر معاشرے میں مخصوص کھانوں کا اہتمام کیا جاتا ہے جو کہ کچھ علاقوں کا خاصہ ہوتا ہے اور مخصوص علاقوں میں تیار کیا جاتا ہے اور انہیں مرغوب غذا کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ گو کہ وہ بظاہر نئی چیز نہیں ہوتی لیکن اس کے پکانے اکا اہتمام دلکش اور انوکھے انداز سے کیا جاتا ہے اور ان کی پیشکش بھی

منفرد ہوتی ہے، لہٰذا ایسے کھابے دور دراز تک مشہور و معروف ہو جاتے ہیں، ایسی ہی جھلک ڈاکٹر رضوان اپنے میانوالی کے سفر کے موقع پر ایک کھابے کا ذکر یوں کرتے ہوئے پیش کرتے ہیں جو کہ خود نوشت میں مذکور ہے۔:

"میانوالی پہنچے تو ابرار نے بتایا کہ یہاں سے ۱۰۰ کلو میٹر سے زیادہ فاصلے پر ایک جگہ ہے وہاں کا رانجھا گوشت بہت مشہور ہے، بالکل ایسے جیسے ٹنڈو آدم کی سجی مشہور ہے۔ وہ شخص تو اب نہیں رہا جس نے اس کا آغاز کیا تھا، اب اس کی بیٹیاں یہ کام کر رہی ہیں اور اس کی بڑی مانگ ہے۔"(۱۲)

آپ بیتیوں میں نہ صرف اپنی ذات کو زیرِ بحث لایا جاتا ہے مگر اس دوران گردشِ دوراں میں ہونے والے حادثات و واقعات بھی آپ بیتیوں کا بیش بہا حصہ بن کر ابھرتے ہیں اور تاریخ کے تھپیڑے ایسی تصانیف میں جگہ پاتے ہیں۔ ریڈیو پاکستان اور پاکستان ٹیلیویژن کی معروف خبر خواں (نیوز ریڈر) ماہ پارہ صفدر اپنی تصنیف "میرا زمانہ میری کہانی" میں اپنے وقت کی یادداشتوں کی پوٹلی کھولتے ہوئے تحریر کرتی ہیں:

"دس اپریل ۱۹۸۸ء کی صبح اسلام آباد اور راولپنڈی کے شہریوں کو کاہے کو یہ علم ہوتا کہ آج دونوں شہروں میں قیامتِ صغریٰ برپا ہونے والی ہے اور بہت سے افراد جو معمولاتِ زندگی کے لیے گھروں سے نکل رہے تھے، کبھی گھروں کو واپس نہیں لوٹ سکیں گے۔ مگر ریڈیو پر کسی کو کچھ معلوم نہیں کہ کیا ہو رہا ہے۔ میں عمارت سے باہر نکل کر لان میں ذرا اونچائی پر کھڑی ہو گئی کہ ذرا دیکھوں تو سہی کہ دھماکوں کی آوازیں کہاں سے آ رہی ہیں۔ خیر اتنے میں ہمارے رپورٹر نے آ کر بتایا کہ راولپنڈی کے علاقے فیض آباد میں اسلحے کے ڈپو اوجڑی کیمپ میں موجود سٹنگر میزائلوں اور راکٹوں کے ذخیرے میں آگ لگ گئی ہے، جس سے میزائل چلنے شروع ہو گئے ہیں یہ آوازیں وہیں سے آ رہی ہیں۔

فیض آباد اسلام آباد سے بالکل متصل راولپنڈی کا علاقہ ہے۔ گویا کہ اُس میں موجود اوجڑی کیمپ ریڈیو پاکستان سے چند ہی میل دوری پر تھا سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ راکٹ آسمان سے برس رہے ہیں یا زمین سے نکل رہے ہیں۔"(۱۳)

تاریخ کے حوالے سے ماہ پارہ صفدر ایک اور جگہ ایران کے شہر مشہد کے متعلق رقم کرتی ہیں؛

"انقلابِ ایران سے پہلے جب ایرانی جب بہت ماڈرن تھے، تب بھی اہلِ تشیع کے آٹھویں امام رضا سے ان کی عقیدت دنیاوی معاملات سے بالاتر تھی۔ شاہ ایران اور ملکہ فرح کی جو سرکاری تصاویر جاری کی جاتی تھیں، اُن میں وہ امام کی قبر کے گرد جالی کے سامنے کھڑے ہوتے تھے۔

یہاں ایک استاد محمد صادق نجفی کا کہنا تھا کہ ایرانیوں کا عقیدہ ہے کہ بارہ سو برس قبل یعنی بارہ صدی قبل یہ ایک چھوٹا سا گاؤں تھا اور امام رضا کی یہاں آمد، شہادت اور قبر کی خیر و برکت ہے کہ ایران میں تہران کے بعد دوسرا ایسا بڑا شہر بن چکا ہے جو ایران کی معیشت میں بہت اہم کردار ادا کرتا ہے۔"(۱۴)

دنیا کے کسی بھی کونے کے مکین ہوں ان کے معاشرے میں کچھ ایسی مخصوص رسوم و رواج یعنی ثقافتی رنگ ہوتے ہیں جو کسی بھی قوم یا معاشرے کو دوسروں سے منفرد اور جداگانہ شناخت بخشتے ہیں۔ کوئی بھی سوانح عمری ہو یا آپ بیتی ان میں ثقافتی انفرادیت اور شخصیت سے منسلک چند ایسی دلکش و قطعی جداگانہ چیزیں جڑی ہوتی ہیں جنہیں دیکھ کے نیا پن اور منفرد تصور ابھرتا ہے۔ ابوالکلام کی سوانح حیات میں کچھ ایسی ثقافتی نشانیاں سامنے آتی ہیں:

"اُس زمانے میں علاوہ تعلیم کے ایک بہت بڑی چیز مفید مردانہ ورزشیں اور بعض تفریحی کھیل تھے، جن کو سوسائٹی میں بہت اہمیت دی جاتی تھی، مثلاً تیر اندازی، پیراکی، کشتی، پنجہ کشی، خوش نویسی۔ ان تمام چیزوں کو بھی اُنہوں (والد مرحوم) نے اپنے وقت کے بڑے بڑے استادوں سے حاصل کیا تھا۔ مثلاً خوش نویسی حافظ امام بخش سے جو خط نسخ میں امام وقت مانے جاتے تھے۔ پنجہ کشی حافظ امیر پنجہ کش سے، تیراکی میر مچھلی سے جو اُس زمانے میں قلعے کے سب سے بڑے پیراک استاد تھے اور تمام شاہ زادے ان سے سیکھتے تھے۔"(۱۵)

آپ بیتی ادب کی ایک دلچسپ صنف ہے، اس میں کسی کے لیے کسی بھی علمی سند کی کوئی قید و بند نہیں ہے، ایک عام شخص اس حوالے سے کہ اس نے کسی بڑے عہدے پر براجمان رہا ہو یا کسی اہم سیاسی یا کوئی بھی بڑی ذمہ داری نہ نبھائی ہو لیکن وہ بھی اپنے تجربات اور احساسات روشنائی کے ذریعے قلمبند کرنے کا اہل ہو سکتا ہے، یہاں پر ذکر کرنا ضروری ہے کہ ایک نائب قاصد سپریم کورٹ، پاکستان، جنہوں اپنی خود بیتی تحریر کی۔ لیکن یہاں پر سابق چیف جسٹس، سپریم کورٹ پاکستان جناب ارشاد حسن خان کی تصنیف سے اقتباس پیش کیے جاتے ہیں، جنہوں نے اپنے آبائی شہر میں اپنی ثقافتی طرز کی حویلی کا تذکرہ کرتے ہوئے تحریر کیا ہے کہ:

"بٹالہ شہر میں ایک بڑی سی حویلی نما جگہ اب بھی میری یادداشت میں موجود ہے۔بڑی سی حویلی، اونچی چھت والے کمرے، کھلے دالان۔۔۔میں آنکھیں بند کرتا ہوں تو فلم کی طرح میرے سامنے آجاتے ہیں،اس جگہ کو "بھائی داویہڑا" کہا جاتا تھا۔دائیں ہاتھ مسجد تھی اور بڑے سے کھلے صحن میں کنواں۔۔۔اس سے آگے ایک بازار تھا جہاں سونے کے زیورات کی پندرہ بیس دکانیں تھیں،ان دکانوں کے آگے مختلف ٹھیلے لگتے، پھل فروٹ، سبزی، بچوں کے کھلونے اور عام استعمال کی چیزیں ہر وقت دستیاب ہوتیں۔"(۱۶)

ارشاد حسن خان ثقافتی حوالے سے ملائیشیا کے بارے میں تحریر کرتے ہیں:

"چیف جسٹس صاحبان کی ایسی ہی ایک کانفرنس کے سلسلے میں ملائیشیا جانے کا بھی موقع ملا۔وہاں کا ایک رواج دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی کہ سرکاری عشائیے کے دوران جب کھانے کا وقت آیا تو سب لوگ اپنے جوتے اتار کر کھانے کے لیے بیٹھے۔"(۱۷)

دنیا کے نقشے پر جتنے ممالک ہیں، جتنی قومیں آباد ہیں، ہر کسی کے باوقات کار کا طریقہء کار منفرد ہوتا ہے۔ہر قوم اپنی شناخت سے مطمئن ہوتی ہے اور اپنی ثقافتی اور معاشرتی زندگی کو ہی بہتر گردانتی ہے۔یہاں پر روس کے موجودہ صدر پیوٹن کی سوانح عمری سے ان کی بیگم لُدمیلا پُوتنا کے چند خیالات کی ایک جھلک دیکھتے ہیں کہ انہوں نے جرمنی میں سکونت کے دوران جرمن خواتین کو کیسا پایا،ان کے بارے میں کیا کہتی ہیں:

"جرمن خواتین کا کپڑے سکھانے کا انداز بہت دلچسپ ہے۔صبح سات بجے،کام پر روانگی سے قبل وہ اپنے کپڑے اٹھائے رہائشی عمارت سے باہر نکلتی ہیں۔عمارت کے سامنے گراؤنڈ میں متعدد آہنی کھمبے نسب ہیں۔ہر خاتون خانہ کھمبوں کے درمیان اپنی ڈوری کھینچتی ہے اور چٹکیوں کی مدد سے انتہائی قرینے کے ساتھ، قطار در قطار کپڑے اس ڈوری پر لٹکا دیتی ہے۔یہ منظر آنکھوں کو بھلا لگتا ہے۔جرمنوں کی گھر گرہستی نفاست اور ڈسپلن کی آئینہ دار ہوتی ہے۔"(۱۸)

مندرجہ بالا آپ بیتیوں کے اقتباسات سے اندازہ کرنا مشکل نہیں رہتا کہ آپ بیتی یا سوانح عمری میں تاریخ سمیت ثقافت، معیشت، سماجی اقدار کو معلوم کرنا آسان ہے اور تاریخ از خود تشکیل ہوتی رہتی ہے۔

حوالہ جات

۱۔ ڈاکٹر محمد عمر رضا، اردو میں سوانحی ادب: فن اور روایت، فکشن ہاؤس، لاہور، ۲۰۱۲ء، ص۔ ۲۲

۲۔ ڈاکٹر صبیحہ انور، اردو میں خود نوشت سوانح حیات، نامی پریس، لکھنؤ، ۱۹۸۲ء، ص۔ ۶۰

۳۔ محمد عمر رضا، اردو میں سوانحی ادب: فن اور روایت، فکشن ہاؤس، لاہور، ۲۰۱۲ء، ص۔ ۲۴

۴۔ ڈاکٹر صبیحہ انور، اردو میں خود نوشت سوانح حیات، نامی پریس، لکھنؤ، ۱۹۸۲ء، ص۔ ۶۱

۵۔ محمد عمر رضا، اردو میں سوانحی ادب: فن اور روایت، فکشن ہاؤس، لاہور، ۲۰۱۲ء، ص۔ ۲۶

۶۔ جسٹس (ر) حاذق الخیری، جاگتے لمحے، رائل بک کمپنی، کراچی، ۲۰۱۷ء، ص۔ ۳۶

۷۔ جسٹس (ر) حاذق الخیری، جاگتے لمحے، رائل بک کمپنی، کراچی، ۲۰۱۷ء، ص۔ ۹۲

۸۔ جسٹس (ر) حاذق الخیری، جاگتے لمحے، رائل بک کمپنی، کراچی، ۲۰۱۷ء، ص۔ ۹۶

۹۔ ڈاکٹر رضوان اللہ خان، ٹنڈو آدم سے کراچی، فضلی سنز، اردو بازار کراچی، ۲۰۱۹ء، ص۔ ۱۵

۱۰۔ ڈاکٹر رضوان اللہ خان، ٹنڈو آدم سے کراچی، فضلی سنز، اردو بازار کراچی، ۲۰۱۹ء، ص۔ ۱۷

۱۱۔ ڈاکٹر رضوان اللہ خان، ٹنڈو آدم سے کراچی، فضلی سنز، اردو بازار کراچی، ۲۰۱۹ء، ص۔ ۱۷

۱۲۔ ڈاکٹر رضوان اللہ خان، ٹنڈو آدم سے کراچی، فضلی سنز، اردو بازار کراچی، ۲۰۱۹ء، ص۔ ۳۱۷

۱۳۔ ماہ پارہ صفدر، میرا زمانہ میری کہانی، بک کارنر، جہلم، ۲۰۲۲ء، ص۔ ۱۹۴، ۱۹۳

۱۴۔ ماہ پارہ صفدر، میرا زمانہ میری کہانی، بک کارنر، جہلم، ۲۰۲۲ء، ص۔ ۳۵۴

۱۵۔ ملیح آبادی، آزاد بیتی، دارالمصحف، لاہور، ۲۰۲۰ء، ص۔ ۵۷، ۵۶

۱۶۔ ارشاد حسن خان، ارشاد نامہ، فیروز سنز، لاہور، ۲۰۲۱ء، ص۔ ۶۲

۱۷۔ ارشاد حسن خان، ارشاد نامہ، فیروز سنز، لاہور، ۲۰۲۱ء، ص۔ ۲۷۸

۱۸۔ ڈاکٹر نجم السحر بٹ: مترجم، مرد آہن (روسی صدر پوتن کی سوانح عمری)، جمہوری پبلیکیشنز، لاہور، ۲۰۱۷ء، ص۔ ۸۱، ۸۰